

Article

## THE CONCEPT OF COLOR IN CLASSICAL URDU POETRY

### کلاسیکل اردو شاعری میں رنگ کا تصور

Amer Hassan\*<sup>1</sup>

<sup>1</sup> Lecturer Urdu, Punjab College City Campus, Lahore.

\*Correspondence: [zeghamshah08@gmail.com](mailto:zeghamshah08@gmail.com)

<sup>1</sup> عامر حسن

<sup>2</sup> لیکچرار اردو، پنجاب کالج سٹی کیس، لاہور۔

#### ABSTRACT:

Color occupies extreme significance in Urdu poetry. God loves color very much and He has mentioned many colors in The Holy Quran with white, black, red, green, blue, pink and dark green being the prominent colors. In this research article, Muhammad Quli Qatab Shah, wali dakni Qaim chand Puri Mir Taqi Mir Mir Hassan Haider Ali Attish Ghalib and Momen Khan Momen. have been included. The poets mentioned above have used colors to define beauty, feeling and different metaphors.

eISSN: 2707-6229

pISSN: 2707-6210

DOI:

<https://doi.org/10.56276/tasdiq.v5i01.158>

Received: 21-05-2023

Accepted: 25-06-2023

Online: 10-07-2023



**Copyright:** © 2023

by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license

**KEYWORDS:** Colour, Color, Classical Urdu Poetry Sight, Universal, Quli Qatab Shah, Wali Deccani, Qaim Chand Puri, Mir Taqi Mir, Mir Hassan, Haider Ali Aatish, Ghali, Momin Khan Momin

اردو شاعری میں رنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رنگ بذات خود ایک زبان ہے رنگ بولتے ہیں۔ رنگ بات کرتے ہیں اور رنگ اپنے اندر معنوں کا سمندر رکھتے ہیں۔ رنگ ایک افاتی طاقت ہے۔ جس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے رنگوں کو سمجھنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔ ہر رنگ اپنے اندر ایک دنیا رکھتا ہے۔ رنگ ایک خاموش پیغام ہے۔ رنگ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر رنگوں کا ذکر کیا ہے۔ سفید رنگ کا قرآن کریم میں زیادہ ذکر ملتا ہے۔ ایک جگہ اللہ فرماتے ہیں:

”حَتَّىٰ يَبْيُنِّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَمْرِ سَوْدٍ مِنَ الْفَجْرِ“ (۱)

ترجمہ: "یہاں تک کہ صبح کی سفیدی دھاری (رات) سیاہ دھاری سے رنگ نظر آنے لگ۔"

الْخَيْطُ كُوْعَرَبِيٍّ فِي مِثْلِ دِهَاقِ كُوْكَهَاجَاتَا هِيَ۔ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ سِے مِرَادِ دِنِ اَوْر صَبْحِ كِي سَفِيْدِي هِيَ۔ سِيَاهِ رَنْگِ كَا

قِرْآنِ مِیْنِ كِچھِ ذِكْرِیُوں مِلْتَا هِيَ:

”يَوْمَ تَبْيِغِي وَجْوهَ وَ تَسْوَدُّ وُجُوهُهُمْ الْفَرْتَمِ بَعْدًا لِمَالِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ“ (۲)

ترجمہ: (جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں

گے (ان سے اللہ فرمائے گا) کیا تم ایمان لا کر کافر ہو گئے تھے سو اس کفر کے بدلے عذاب چکھو۔)

مذکورہ بالا آیت میں دو رنگوں کا ذکر آیا ہے سفید اور سیاہ لیکن اللہ یہاں سیاہ منہ والوں سے مخاطب ہے۔

سورۃ یوسف میں سبز رنگ کا ذکر کچھ یوں آیا ہے:

”وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَعْدَاتٍ سِمَانًا يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعٌ سُنبُلَاتٍ خُضْرًا وَأُحَدًا“

یابسات“ (۳)

ترجمہ: (اور بادشاہ نے کہا میں نے (خواب دیکھا ہے) دیکھتا (کیا) ہوں کہ سات موٹی گائیں جن کو سات دہلی پتی گائیں کھا رہی

ہیں اور سات خوشے سبز ہیں اور (سات) خشک۔)

مندرجہ بالا آیت میں سبز رنگ کا ذکر ملتا ہے۔

ایک اور رنگ کے بارے میں مالک کا فرمان ہے:

”يَوْمَ يُنْفَعُ فِي الصُّوبِ وَ نَحْسَبِدِ الْمَجْدِ مِیْنِ یَوْمِ عِزْرَقَا“ (۴)

ترجمہ: (جس روز صور پھونکا جائے گا اور ہم گنہگاروں کو اکٹھا کریں گے اور ان کی آنکھیں نیلی نیلی

ہوں گی۔ یہاں اللہ نے نیلے رنگ کا ذکر کیا ہے گنہگاروں کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔)

مطلب نیلا رنگ یہاں خوف کی علامت ہے۔ احمر عربی میں سرخ رنگ کو کہا جاتا ہے۔ اس رنگ کے بارے میں قرآن میں کچھ

یوں ذکر ملتا ہے:

”وَمِنَ الْجِبَالِ حَدْدٌ بَيْضٌ وَ حَمْدٌ مَخْتَلَفٌ الْوَالِهَا وَ عِزَابِیْبٌ سَوْدٌ“ (۵)

ترجمہ: (اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں (بعض) کالے سیاہ ہیں۔)

گلابی رنگ کا قرآن کریم میں ذکر کچھ یوں ملتا ہے:

”فاذا الشفت السماء فكانت و عدة كالدهان“<sup>(۶)</sup>

ترجمہ: (پھر جب آسمان پھٹ کر تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو) وہ کیسا ہولناک دن

ہو گا۔)

مذکورہ بالا آیت میں ایک ہولناک منظر بیان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں گہرے سبز رنگ کا بھی ذکر ملتا ہے:

”مدھا متان“<sup>(۷)</sup>

ترجمہ: (دونوں خوب گہرے سبز۔)

رات کی تاریکی کو اور سبز رنگ کو عربی میں ڈھمتہ کہا جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں رنگ دیکھنے میں ایک جیسے ہیں۔ ادب کسی بھی زبان کا وہ ہو جو انسانی زندگی کا حقیقی ترجمان ہوتا ہے۔ اردو ادب کی بات کی جائے تو آغاز میں اس کا انسانی زندگی سے تعلق کم اور لطافت سے زیادہ تھا۔ لوگ اپنی زبان کے ذائقے کی تبدیلی کے لیے اردو میں شعر کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ شعراء نے اس پر دھیان دیا اور اسے عروج پر پہنچایا۔ اسی طرح انگریزوں نے برصغیر میں اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے کچھ ادارے کھولے جنہوں نے اردو نثر پر دھیان دیا اور زبان کو ترقی کے راستے پر گامزن کیا۔ ادب کی دو بڑے میدان ہیں، ایک نثر اور دوسرا نظم۔ نثر اور نظم کو مزید کئی اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شاعری کو پرکھنے کے لیے اردو نقادوں نے اسے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک شاعری کی فکر اور دوسرا فن، فکر کی طرح فن کا کیسوس وسیع ہے۔ فن میں علم بیان اور علم بدیع شامل کیا گیا ہے۔ علم بیان اور بدیع نے اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں علم بیان میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز مرسل ہیں جبکہ علم بدیع میں کثیر صنعتیں ہیں۔

اردو شعراء نے اپنے کلام میں حسن پیدا کرنے کے لیے رنگوں کا استعمال کیا ہے کہیں یہ رنگ تشبیہ ہیں تو کہیں یہ استعارہ اور کہیں یہ علامت۔ محبوب کا سراپا ہو، انا کو برتنا، شکایت کے لیے رنگوں کا خوب استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ شعراء نے تو سادہ پانی کو شام کے رنگوں کو سامنے رکھ کر شراب کی سی لذت محسوس کی ہے الغرض زندگی کے ہر رنگ نے شاعری تخلیقات میں حسن پیدا کیا ہے۔ میرا موضوع کلاسیکل اردو شاعری میں رنگ کا تصور“ ہے۔

ان شعراء میں محمد قلی قطب شاہ، قائم چاند پوری، ولی دکنی، میر تقی میر، میر حسن حیدر علی آتش، غالب اور مومن شامل ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اردو شاعری کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں رنگ کا تصور موجود ہے۔ ایک مرتبہ ان کو دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی اور گرمی کے موسم کا اختتام ہوا، برسات کا آغاز ہوا۔ وہ برسات نہ تھی گویا موسم مرگ تھا۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی اُس نے اپنی خوشی کا اظہار نظم کی صورت میں کرتے ہیں، لیکن اس دفعہ ان کی خوشی دگنی تھی ایک تو بہار کی آمد اور دشمنوں پر فتح

چنانچہ وہ اپنی ایک نظم میں اس خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آج پھر مرگ سلطانی ستارہ بن کر آیا ہے۔ سوکھے ہوئے درخت جن کو خزاں نے بے لباس کر دیا تھا۔ وہ سب درخت پھر سے سرسبز ہو کر اپنے سروں پر لال تاج رکھنے لگے ہیں۔ اس موقع پر لعل کے خیر چہرے پر بھی لال رنگ زیب دینے لگا کیوں کہ اس رنگ سے سورج شرماتا کہ ہر رات منہ چھپا لیا ہے۔ ہم یہاں صرف دو شعروں کا ذکر کریں گے۔

چونکہ نظم ان دو شعروں میں، سبز اور لعل رنگ کا تصور موجود ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

مرگ سلطانی ستارہ جگ میں آیا پھر آج  
 ڈکھ سکل سرسبز ہو کر سر تھے کھلے، لعل تاج  
 لال رنگ کھلیا ہی مکھ پر لال کے لعل بد حش  
 تو سورج اس رنگ تھی ہر رات جاوے لال لال (۸)

یہاں سبز اور لعل رنگ خوشحالی کا استعارہ ہے۔ جب بہار آتی ہے وہ اپنے ساتھ صرف رنگ نہیں لاتی خوشحالی بھی لاتی ہے۔ ان کی ایک اور نظم کے دو شعر رنگ کے حوالے سے دیکھیے گا۔ محمد قلی قطب شاہ کے جب دشمن تباہ ہو جاتے ہیں اور عزیز خوشحال ہو جاتے ہیں۔ آسمان تو اسے کے کناروں کا رنگ شفق ہی نہیں بل کہ دشمن کے مارے جانے کی وجہ سے ان کا خون اچھل کر آسمان کو جا لگا ہے۔ محسوس ہوتا ہے وہ رنگ کے استعارے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

اننداں سیتے بھی آیا مرگ سماں  
 دندیاں پامال عزیزاں ہوئے خوشحال  
 کنارے آسماں کے نہیں شفق رنگ  
 دندیاں گئے اچھلیا کت لال (۹)

مذکورہ بالا دو سرے شعر میں شفق اور لال رنگ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ولی دکنی کا شمار اردو غزل کے بانوں میں ہوتا ہے، ان کی غزل کے فکرونی حوالے سے کئی پہلو ہیں۔ ہم صرف ان کے کلام میں رنگ کا تصور دیکھیں گے۔ ولی دکنی کے کلام کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک خوبی سراپا نگاری ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لبوں کو حوض کا خزانہ کہتا ہے ایسا خزانہ جو کبھی ختم نہ ہو شاعر نے محبوب کے لبوں کو حوض کوثر اس لیے کہا جس طرح حوض کوثر کے پانی پینے کے بعد پیاس نہ لگے گی۔ اس طرح کی خوبی محبوب کے لب لیے ہوئے ہیں۔ درج ذیل شعر ملاحظہ ہو:

تیرے لب ہمیں بہ رنگ حوض کوثر مخزن خوبی  
 یہ خیال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا (۱۰)

مذکورہ بالا شعر میں لفظ رنگ حوض کوثر کے خزانے کی کیفیت کو بیان کرتا ہے اور دوسرے مصرع میں خوشبودار تل کی بات کی گئی اور ساتھ حضرت بلال کی تلمیح استعمال کی گئی ہے۔ گویا خوشبودار تل بلال کے رنگ کی طرح کالا ہے۔  
 ولی دکنی جہاں اپنے محبوب کی زلفوں کی تعریف کرتے ہیں وہاں اس کے تل کی بھی بڑی تعریف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سامری جیسا جادوگر زلفوں کے طلسم کو دیکھ کر الجھ جائے اور تو محبوب کا زمر درنگ کا تل دیکھ کر شاعر پر باختر جیسا سحر تاری کر دے تو شاعر گویا ہوتا ہے:

پریشاں سامری کا دل زلف طلسمی میں  
 زمر درنگ یو تل مجھ کوں سحر باختر دستا<sup>(۱۱)</sup>

یہاں شاعر نے اپنے محبوب کے تل کو زمر درنگ کہا ہے اور تل کو شہر باختر کی طرح اہمیت دی ہے۔ باختر ایک قدیم ایشیائی سلطنت (جو موجودہ افغانستان، ترکمانستان، اور ازبکستان کے علاقوں پر مشتمل) تھی۔ یہ علاقہ سکندر اعظم اور نئی نسلوں تک یونان کے زیر اثر رہا۔ اب اس کا نام بلخ اور یہ ایک صوبہ ہے۔ محبوب کے زمر درنگ کو ایک بڑی سلطنت کہا گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر نے محبوب کے تل کو شہر باختر کے تمام جادو سے بڑھ کر پایا ہو۔

ولی دکنی اپنے محبوب سے کہتا ہے اگر تیری تصویر کو نقاش ازل دیکھ تو وہ بھی حیرت میں جا پڑیں:  
 تجھ صاحب نیرنگ کی دیکھے اگر تصویر کوں  
 دل جا پڑے حیرت میں نقاش رنگ آمیز کا<sup>(۱۲)</sup>

یہاں رنگ سے مراد اللہ کی ذات ہے۔ ولی دکنی اپنے محبوب کے خط کو خشکی اور تری کا حکمران تک کہ دیتے ہیں۔ باقی تمام رنگوں استعاروں اور تمام اشیاء کی محبوب کے خط کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ایک شعر دیکھیے گا:

تیرا خط رنگ اے شوخ  
 سلطان ہے خشکی و تیری کا<sup>(۱۳)</sup>

لڑکوں کے آغاز جوانی میں رخسار اور لبوں پر جو پہلی بار بال نمودار ہوتے ہیں انھیں خط کہا جاتا ہے۔ خط کو پیشانی پر بڑھنے والی لکیر کو بھی کہا جاتا ہے اگر خط کو بطور لکیر تو بھی یہاں لفظ رنگ کیفیت کے لیے استعمال ہوا یا پھر لڑکوں کے پہلی بار لب اور رخسار پر نمودار ہونے والے بال لیں تب بھی حالت اور خوب صورتی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

ولی نے اپنے کلام میں محبوب کے سراپے کو بتانے کے لیے فطرت کی خوب صورتی کا بھی سہارا لیا ہے:

اے گل باغ حسن مکھ لبوں تیرے  
جلوہ پیرا ہے رنگ، بو بے حیا<sup>(۱۳)</sup>

مذکورہ بالا شعر میں لفظ رنگ و بو خوب صورتی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ولی دکنی کا رنگ پر ایک اور شعر ہے جس میں ولی دکنی محبوب کی آنکھوں کو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ محبوب کی آنکھوں میں شراب کی سی کیفیت ہے:

عالم کا ہوش کیوں کہ رہے گا عجب ہوں میں  
چلتا ہے اس نین سوں رنگ شراب آج<sup>(۱۵)</sup>

درج ذیل شعر میں ولی دکنی نے اپنے محبوب کے لیے رنگ کا استعارہ بطور شمع بھی استعمال کیا اور عشاق کو پروانہ کیا ہے:

یہ رنگ شمع بزم حسن میں ہے جب سوں توں روشن  
پتنگ آسا ترے اوپر ہلا گرداں ہوئے عاشق<sup>(۱۶)</sup>

قائم چاند پوری کے ہاں رنگ کا استعارہ موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں شراب کا پیالہ، مئے سے بالکل بھرا ہوا ہے۔ پینے کے بعد ہوش باقی نہ رہے گا۔ یہاں شاعر نے رنگ کو بطور نشہ لیا ہے اس کا مطلب ایک اور بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ دینا۔ شعر ملاحظہ ہو:

پر ہے یہ مئے سے رنگ کی اب کے ایان گل  
جھمکے ہے مثل شعلہ ہر اک سو چراغ گل<sup>(۱۷)</sup>

شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتے ہیں۔ پیالا کناروں تک اس قدر بھرا ہوا ہے کہ جسے چراغ گل سے شعلہ باہر لپکتا ہے۔ میر تقی میر کے ہاں رنگ کا تصور موجود ہے۔ آپ کو خدائے سخن کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں ان کے صرف چند اشعار کو رنگ کے حوالے سے زیر بحث لایا جائے گا۔

میر تقی میر نے رنگ کے استعارے کو آنسو کی جگہ استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شعر دیکھیے گا:

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو  
 ٹکڑا ہے مرا اشک عقیق جگری کا (۱۸)

مذکورہ بالا شعر کے پہلے مصرع میں رنگ بطور آنسو لیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے مصرع میں آنسو کو جگر کا خون کہا گیا ہے اور اس کے لیے لفظ عقیق استعمال کیا گیا ہے یعنی میرا اشک عقیق گلزار کا ٹکڑا ہے۔

میر تقی میر نے رنگ کے استعارے میں اپنے غم کو بھی بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اے میر تراقد مثل کمان جھک گیا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے تجھ سے تیری جوانی چھین لی ہے۔ ترا جسم کمزور ہو گیا ہے۔ اور تیرا غم سے عجیب حال ہو گیا ہے۔

قامت حمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار  
 تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا (۱۹)

مندرجہ بالا شعر میں رنگ شکستہ، اور ٹوٹ پھوٹ کی حالت کو بیان کرتا ہے۔  
 میر تقی میر ایک اور جگہ اپنے آنسو کو خون کا درجہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر میں اپنے اشک نہ روکتا تو زمانے کا رنگ میرے خون کے آنسو کی وجہ سے سرخ ہو جاتا ہے۔

میں گر یہ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ  
 ایک میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا (۲۰)

شاعر نے یہاں رنگ کو بطور حالت اور کیفیت کے لیے لیا ہے۔  
 میر تقی میر ایک جگہ فرماتے ہیں غم روزگار میں جتنے لوگوں کا خون ہوا چمن میں پھولوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور چمن کے پھول اس بات کے شاہد ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہزار رنگ کھلے گل چمن کے ہیں شاہد  
 کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا (۲۱)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ حالت اور کیفیت کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

میر تقی میر کے کلام میں رنگ محاورے کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر چمن میں گلابوں کا رنگ اڑ گیا تو کوئی بات نہیں نسیم، ہمیں بھی تو زمانے کے غم نے بے حال و پر کر دیا ہے۔ میر اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

رنگ اڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم  
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا (۲۲)

میر تقی میر نے اپنے کلام میں مئے و ساغر کو بھی ”رنگ“ استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے انہوں نے اپنے عہد کے کرب و درد کو استعارے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

نئی طرزوں سے ملے خانے میں رنگ مے چھلکتا تھا  
گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر جھلکتا تھا (۲۳)

یہاں شراب سے مراد تہذیب اور جام سے مراد تہذیب کے دشمن اور رنگ سے مراد نئی تہذیب ہے۔ میر حسن کا اردو شاعری کے حوالے سے اہم مقام ہے۔ یہاں ہم ان کے ہاں صرف رنگ کا تصور دیکھیں گے۔ اگر ہم ان کے تمام اشعار جن میں رنگوں کا ذکر ہے زیر بحث لائیں تو ایک مقالہ مرتب ہو سکتا ہے مثنوی ”سحر البیان“ میں آغاز داستان میں میر حسن ایک بادشاہ کا قصہ سناتے ہیں کہ وہ بہت جاہ و جلال اور عظمت والا تھا، اس کی حشمت و جاہ کی وجہ سے بادشاہوں کے بادشاہ اسے خراج دیتے تھے۔ ہر جگہ عیش و عشرت اور راگ رنگ کی محفلیں گرم تھی۔

یہاں پر رنگ کے حوالے سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

سدا عیش و عشرت، سدا راگ و رنگ  
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بہ رنگ (۲۴)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ، کیفیت اور خوب صورتی کے زمرے میں استعمال ہوا۔ جب بادشاہ کا بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ عزباء مساکین اور ہر قسم کے ضرورت مند کو نوازتا ہے۔ یہاں تک بادشاہ ہر طبقے کو اپنی خوشی سے اس کی وقعت اور حیثیت سے نوازتا ہے۔ پورے چھ دن، عید اور رات کو شب برات منائی جاتی ہے۔ وہاں طفوانگن ہیں۔ رنگ و راگ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں تو میر حسن کہتے ہیں:

طواف وہی اور وہی راگ و رنگ  
ہوئی بلکہ دُونی خوشی کی ترنگ (۲۵)

میر حسن فرماتے ہیں طوائف تو وہی اور راگ اور رنگ کی محفل بھی وہی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اب خوشی دو بالا ہو چکی کہ اللہ نے بادشاہ کو صاحب اولاد کر دیا تھا۔ یہاں پر بھی رنگ دلکشی اور حالت یا کیفیت کی صورت میں استعمال ہوا ہے۔

میر حسن نے سحر البیان کی ہر داستان کا آغاز ساقی نامہ سے کیا ہے اور ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار میں صفتِ براعت، استہلال سے کام لیا ہے۔ الفاظ اس قدر خوب صورتی سے استعمال کیے ہیں جن سے داستان کے مطلب کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

مئے ارغوانی بلا سا قیا!  
کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا (۲۶)

مذکورہ بالا شعر میں لفظ ارغوانی استعمال ہوا ہے۔ ارغوانی سرخ رنگ کو کہا جاتا ہے۔ ارغوانی جنگلی خشخاش کے پیڑ کی طرح ایک پودا ہے جو زمین پر بچھا رہتا ہے (اس پر سرخ پھول لگتے ہیں) مئے ارغوانی سے مراد سرخ شراب ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے ہاں بھی رنگ کا تصور موجود ہے۔ وہ رنگ کے استعارے کو اپنے محبوب کے حسن کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آتش کہتے ہیں۔ اے محبوب ترا روشن چہرہ پھول پر سبقت لے گیا ہے۔ اور تیرے قد کے سامنے سرو بھی شرمائے ملاحظہ ہو:

گل پر شرف ترا رخ رنگ لے گیا  
قد کا بلند رتبہ شمساد سے ہوا (۲۷)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ خوب صورتی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

حیدر علی آتش کے ہاں، ہجر کی وجہ سے پیدا ہونے والی حالت موجود ہے جس کو وہ رنگ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں غم ہجران انسانی خون کو جو نک کی طرح چوس لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کی رنگت سفید پڑ جاتی ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

غم ہجران سے لیتا ہے لہو جو نک کی طرح  
کیوں نہ ہو رنگ رخ آتش دل گر سفید (۲۸)

حیدر علی آتش کہتے ہیں کہ میرے محبوب کا بدن اس قدر خوب صورت ہے اس کے سامنے بہار کی خوب صورتی کچھ بھی نہیں ہے اگر ہزار بار بہار پھول بھی کھلائے تو وہ خوب صورتی دکھانے سے قاصر ہے جو میرے محبوب کے بدن سے جھلکتی ہے:

وہ رنگ و بو بدن یار میں جو ہے سو کہاں ہے  
شگوفے ایسے کھلایا، کرے ہزار بہار (۲۹)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ خوب صورتی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

حیدر علی آتش اپنے کلام میں محبوب کے حسن کو سرخ رنگ اور اس کے لباس کو سبز رنگ کے استعارے کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ پھر سبز اور سرخ رنگ کی مشابہت شراب میں بھی ڈھونڈتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں محبوب کے سراپے اور اس کی خوب صورتی اور مستی کو اجاگر کرتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

سبز پیرہن میں رنگ سرخ یوں ہے یار کا  
جیسے مینائے زمردگوں میں گلگوں باد ہ ہو (۳۰)

مذکورہ بالا شعر میں سرخ رنگ استعارہ ہے۔ محبوب کے حسن جگہ استعمال ہوا ہے دورنگ اور بھی موجود ہیں سبز اور زمر۔ مرزا غالب کے ہاں بھی رنگ کا تصور موجود ہے۔ مرزا غالب کے ہاں رنگ مختلف کیفیات کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ وہ رنگ کو کیفیت یا حالت کے معنوں میں استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میرا شوق ہر حالت میں میرے لیے باعثِ رقیب رہا۔ اور اس کی وجہ سے مجھے رسوائی اور ذلت کا سامنا رہا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

شوق ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا  
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا (۳۱)

مرزا غالب اپنے غم کی حالت کو کچھ یوں بھی بیان کرتے ہیں۔ ہم خوشی کی تمنا اور آرزو کا داغ لیے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب آپ کی مرضی ہے جس طرح چاہیں خوش رہیں۔ غالب کی اس دعا میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ ہم تو داغِ محرومی لیے خاک کی چادر اوڑھ رہے ہیں ہمارے بعد تیری زندگی خوشیوں اور شادمانیوں کا گہوارہ رہے۔ غالب اپنی وضاحت کے لیے ترکیب ”بصد رنگ اور باغ باغ“ تبدیل کر کے گلستان ہونا استعمال کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

لے گئے خاک میں داغِ تمنائے نشاط  
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستان ہونا (۳۲)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ بہار کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مرزا غالب عاشقی اور تمنا کے درمیان ہونے والی کشمکش کو اپنے کلام میں بیان کرتے ہیں، یعنی عاشقی کا تقاضا ہے صبر کیا جائے جبکہ تمنا بے قرار کر رہی ہے۔ مرزا غالب تذبذب کا شکار رہے ہیں کہ وہ اپنے دل کا کیا کرے اور دل کو کہاں رکھیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک (۳۳)

مذکورہ بالا شعر میں رنگ کیفیت کو بیان کر رہا ہے۔

مرزا غالب نے رنگ کو بطور محبوب کے حسن کو نمایاں کرنے کے لیے بھی استعارہ استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے بارے میں کہتے ہیں۔ عشق ہونے کے بعد وہ پری رخ اور بھی نازک مزاج بن گیا ہے۔ اس کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جتنا وہ اپنے رنگ میں کھلتا ہے بجائے اڑ کر ختم ہونے کے وہ کھڑتا جا رہا ہے۔ یہاں پر رنگ خوب صورتی کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے:

ہو کے عشق و ہ پری اور نازک بن گیا  
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا اڑتا جائے ہے (۳۴)

مومن خاں مومن اردو شاعری کا معتبر حوالہ ہے۔ وہ غالب کے ہم عصروں میں شمار ہوتے ہیں، ان کے کلام میں بھی رنگ کا تصور موجود ہے۔ حکیم مومن خاں مومن کے ہاں رنگ کا تصور مختلف معنوں اور کیفیات میں موجود ہے۔ وہ اپنے محبوب سے کہتے ہیں اے محبوب تیرے ہاتھوں پر حنائی رنگ، پہلے بھی میرے لہو سے تھا اور اب بھی ہے، تو اغیار کے قتل سے تجھے کیا حاصل ہوا ہے۔ اور تو بیکار میں اغیار کے قاتل کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

شوخی تھا رنگِ حنا میرے لہو سے سو ہے  
قتل اغیار سے کیا ہاتھ ترے یار لگا (۳۵)

حکیم مومن خاں مومن کے کلام میں رنگ کا استعارہ بطور کیفیت بھی موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وہ بد بخت ہوں لوگوں کی باعث خوشی تو بنا رہا کیا مجال کہ میں بھی کسی کی دستار بنایا جاتا۔ میں اس اعزاز سے محروم رہا۔ عمر بھر لوگوں میں مدبر اور معتبر رہا اور میری ہستی کے تمام حوالے مٹی کی اڑنی میں دفن ہو گئے۔ وہ اپنی اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

بے بخت رنگِ خوبی کس کام کا کہ میں تو  
تھا گل ولے کسی کی دستار تک نہ پہنچا (۳۶)

مومن خاں مومن اپنے محبوب کی زلفوں کی تعریف کرتے ہوئے رنگ کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارے گلشن میں اس کے محبوب کی زلفوں کی خوشبو ہے اور اس خوشبو کے سامنے تمام تر دوسری خوشبو بیکار ہے۔ محبوب کی زلفوں کی پھیلی خوشبو دیکھ خوب صورت سنبل شرمندہ ہے۔ اس مضمون کے رنگ کو شعر میں کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

گہت اس زلف کی نہ ہو  
اڑ گیا رنگ بوئے سنبل کا (۳۷)

مومن اپنے محبوب کو کہتے ہیں میرے رنگ کی تبدیلی پر مت جا اور میرے زرد رنگ کے بارے میں مت پوچھ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ تو اپنے آپ سے آنکھیں نہ ملا سکے۔ اس سے بہتر ہے تو اپنی زندگی میں مصروف رہے میری حالت تیری سمجھ سے باہر ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

مت تغیر رنگ کو مت دیکھ  
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جاوے (۳۸)

## حوالہ جات

- ۱۔ القرآن، سورہ البقرہ، آیت ۱۸۷، پارہ ۲۔
- ۲۔ القرآن، سورہ ال عمران، آیت ۱۰۶، پارہ ۳۔
- ۳۔ القرآن، سورہ یوسف، آیت ۴۳، پارہ ۱۲۔
- ۴۔ القرآن، سورہ طہ، آیت ۱۰۲، پارہ ۱۶۔
- ۵۔ القرآن، سورہ فاطر، آیت ۳۵، پارہ ۲۷۔
- ۶۔ القرآن، سورہ الرحمن، آیت ۳۷، پارہ ۲۷۔
- ۷۔ القرآن، سورہ الرحمن، آیت ۶۴، پارہ ۲۷۔
- ۸۔ محمد علی قطب شاہ، "کلیات محمد علی قطب شاہ"، مطبوعہ مکتبہ ابراہیمہ حیدر آباد دکن، سن، ص: ۱۰۳۔
- ۹۔ ایضاً، ص: ۱۰۴۔

- ۱۰۔ ولی دکنی، "دیوان ولی"، خیام پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۴۔
- ۱۱۔ ایضاً، ص: ۲۵۔
- ۱۲۔ ایضاً، ص: ۳۲۔
- ۱۳۔ ایضاً، ص: ۳۵۔
- ۱۴۔ ایضاً، ص: ۹۱۔
- ۱۵۔ قائم چاند پوری، "انتخاب قائم چاند پوری"، فرخ منظور، س، ن، ص: ۱۹۔
- ۱۶۔ میر تقی میر، "انتخاب غزلیات میر حامدی" کاشمیری، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص: ۳۴۔
- ۱۷۔ ایضاً، ص: ۳۵۔
- ۱۸۔ ایضاً، ص: ۳۷۔
- ۱۹۔ ایضاً، ص: ۴۵۔
- ۲۰۔ ایضاً، ص: ۵۳۔
- ۲۱۔ ایضاً، ص: ۶۷۔
- ۲۲۔ میر حسن، "سحر البیان"، سفیہ ادب، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۹۔
- ۲۳۔ ایضاً، ص: ۷۷۔
- ۲۴۔ ایضاً، ص: ۷۷۔
- ۲۵۔ خواجہ حیدر علی آتش، "دیوان آتش"، خیام پبلشرز، لاہور، س۔ ن۔ ص: ۲۸۔
- ۲۶۔ ایضاً، ص: ۲۸۔
- ۲۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۱۔
- ۲۸۔ ایضاً، ص: ۱۱۹۔
- ۲۹۔ ایضاً، ص: ۱۶۸۔
- ۳۰۔ اسد اللہ خان غالب، "دیوان غالب"، سنگ میل، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۷۔
- ۳۱۔ ایضاً، ص: ۲۷۔
- ۳۲۔ ایضاً، ص: ۴۵۔

- ۳۳۔ ایضاً، ص: ۶۰
- ۳۴۔ ایضاً، ص: ۹۸
- ۳۵۔ مومن خاں مومن، "انتخاب کلام مومن"۔ مرتب سعد اللہ، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۰
- ۳۶۔ ایضاً، ص: ۶۸
- ۳۷۔ ایضاً، ص: ۸۱
- ۳۸۔ ایضاً، ص: ۱۷۹